ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

اقبال کا تصورِ الٰہ

مشہور صوفی مفکر محی الدین ابن عربی نے خدا کے متعلق کہا تھا کہ اس کا وجود ایک حقیقت نفس الامری تو ہے جو حیطۂ تعریف میں نہیں آسکتی لیکن ہر شخص اس کا تصور اپنے طور پر کرتا ہے۔ ان حقیقی اور تصوری ہستیوں میں بہت کچھ مشابہت بھی ہے اور فرق بھی۔ اگر حق تعالیٰ اپنے آپ کو ہم سب پر آشکار کر دے تو بھی ہم اس کی تشریح اپنی ذہنی اور اخلاقی اہلیت ہی کے مطابق کریں گے۔ اگر دو آدمی خدا کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں تو وہ بالاکثر ایک ہی لفظ کو متنوع بلکہ مختلف معنوں میں استعمال کرتے نظر آئیں گے۔ ایک سیدھا سادہ کسان خدا میں حکیم افلاطون یا ہیگل جیسے فلسفی سے بالکل مختلف طور پر اعتقاد رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس انداز سے کوئی عارف ایک حیطۂ تعریف سے باہر، غیر محدود ہستی کا جو زمان و مکان کے حدود اور معروض و موضوع سے بالا ہو، تصور کرے گا، اسے ایک عامی کے تصور سے کوئی مناسبت نہیں ہو سکتی، جو اسے بالکل اپنے جیسی شخصیت خیال کرے گا۔

اسلام میں خدا کے لیے بہت سے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً مشیت، قوت، ارادہ، حکمت، نافذِ نظام اخلاق، محب، محبوب، جمال، حقیقت، خیر، مبدء و معاد، حیات، خالق اور رب وغیرہ۔ قرآن کریم کے مطابق "له الاسماء الحسنیٰ" یعنی اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ ترین نام ہیں۔ یا فلسفہ کی اصطلاح میں وہ تمام حقیقی قدروں کا مرجع و مآب ہے، جن کا دارومدار اور ضمانت اس کی ذات پر ہے۔ حقیقت اخریٰ، واحد اور لا تجزی ہے۔ لیکن اس کے متعدد پہلو ہیں، اور ہر شخص ان سے اپنے طور پر متاثر ہوتا ہے۔

بعض شعرا نے خدا کا تصور کائناتی شاعر کے طور پر کیا ہے۔ چنانچہ براؤننگ کا قول ہے کہ خدا سب سے اچھا شاعر ہے اور دنیائے رنگ و بو اسی کی نوائے سرمدی ہے۔ یا جیسا کہ ولیم واٹسن نے کہا ہے "خدا اپنی مسند جلالی پر بزرگ ترین شاعر ہے اور اس کی نوا پر تمام کائنات حرکت کرتی ہے۔"

(4) ارسطو کی طرح بعض فلسفیوں نے اس کا تصور ایک "خود فکر خیالی" کے طور پر کیا ہے جس کا موضوع اس کی اپنی ذات ہے - یا اسپینوزا کی طرح اس کا تصور ذاتِ محضہ کے طور پر کیا ہے جو جوہر اور صفات و شیون کی متقوم ہے۔

(5) دیگر مفکرین مثلاً نو فلاطونیوں اور ویدانتیوں نے اسے صفات سے بالکل معرّا کر کے ذاتِ محضہ بنا دیا ہے جس کا "ہونے" سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی وہ ایک سکونی مطلق ہے جس کا حرکی پہلو ایک فریبِ نظر ہے۔

(6) مشہور مذہبی ماہرِ نفس ولیم جیمز اس خدا کا ذکر کرتا ہے جو ہزیمت خوردوں اور یاس زدوں کا خدا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اکثر لوگوں کا خدا ایک عدالت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جس میں وہ اپنی دنیاوی ناکامیوں کے بارے میں رائے عامہ کے خلاف اپیل کر سکیں۔

(7) حکیم فیثا غورث اور افلاطون دونوں نے خدا کا تصور ایک مہندس کے طور پر کیا ہے جس سے ایڈنگٹن جیسے بعض جدید سائنسی مفکر بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ایک جرمن صوفی نے، جس کا نام بمشکل ادا کیا جا سکتا ہے، اس کا تصور یوں کیا ہے کہ "خدا ایک بے الفاظ آہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔"

(8) ہولاک ایلیس نے اپنی کتاب Impressions and Comments میں اس تصور کی تحسین کرتے ہوئے اس کو خدا کے متعلق آخری حرف قرار دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابن عربی کا خیال کس قدر صحیح تھا۔ یا جیسا کہ رومی نے کہا ہے:

گر بدیدے حسنِ حیواں شاہ را گاو و خر دیدے ہمیں اللہ را

(9) ایمرسن نے جو "نفسِ کل" کا زبردست حامی تھا، رومی کے خیال کو ذرا زیادہ مزاحیہ رنگ میں کھول کر بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "آدم خور خدا کا تصور آدم خوروں کی شکل میں کریں گے، صلیبی مبارز ایک صلیبی جنگ جو کی شکل میں اور سوداگر، سوداگر کی شکل میں۔"

اقبال کا تصورِ الٰہیہ بھی لازمی طور پر ان کے تصورِ حقیقت و شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ ان میں ایک شاعر کا تخیل، ایک عارف کی بصیرت، منطقیوں اور فلسفیوں کی بحث و نظر اور ایک مصلح کا ذوق و شوق جمع ہو گیا تھا۔ ان کے حقیقتِ اخریٰ کے تصور میں جسے وہ اللہ قرار دیتے ہیں، یہ سب رجحانات کم یا زیادہ شدت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ اقبال زیادہ تر ایک مفکر اور شعورِ ذات کے مبلغ تھے۔ وہ خدا

کا تصور ایک لامحدود "انا" ایک کائناتی خودی، ایک ہستی مافوق، ایک تخلیقی عزم للقوۃ اور لا انتہا امکانات رکھنے والے فرد کے طور پر کرتے ہیں۔ وہ خود ایک لامحدود انا ہے اس لیے اپنا اظہار لاتعداد دوسری اناؤں کی تخلیق سے کرتا ہے۔ جو خدا کی دائمی طور پر تخلیقی حرکیت میں زندہ رہتے اور اس میں نقل و حرکت کرتے ہیں۔ چونکہ خدا آزاد ہے، اس لیے ہر فرد کا جوہرِ خاص بھی آزادی ہے، اور ایک عظیم خالق کے جذبۂ تخلیق میں شامل ہونا اس کے لیے مقدر ہے۔

اقبال کے فکر کی ایک لازمی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا کا تصور اولاً بہ حیثیت "ارادہ" اور ثانیاً بطور "خیال" کرتے ہیں۔ ارادہ اصلی چیز ہے اور خیال اس سے ماخوذ۔ اس لحاظ سے اقبال کا فکر بڑا غیر رسمی ہے اور ان لوگوں کے لیے بڑی چونکا دینے والی چیز ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا ایک خاص وقت خالق بنا اور اس نے کن کہہ کر ازل سے ابد تک تمام حوادث کا تصور ان کے تمام جزئیات کے ساتھ کر لیا جس سے ہر جاندار اور بے جان چیز کی تقدیر ہمیشہ کے لیے مقرر ہو گئی اور تخلیق اپنے آپ کو صرف ان پیرایوں میں ظاہر کرتی ہے جو ضمیرِ حق میں اپنی اٹل سکونی واقعیت کے ساتھ افلاطون کے اعیانِ ثابتہ کی طرح جاگزین ہیں۔ اقبال ضمیرِ الٰہی میں ایسے مکمل و مفصل پیرایوں کی موجودگی کے منکر ہیں۔ اشیا ذاتِ باری کے تخلیقی جذبہ میں صرف بالقوۃ موجود ہیں۔ اس کی مثال وہ ایک بڑے نابغہ کے فیضان میں تلاش کرتے ہیں، خواہ شاعر ہو یا پیغمبر یا سائنسدان۔ ایک خیال جو فیضان سے ابھرتا ہے، بے انتہا امکانات سے مملو ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مختلف مضمرات اور مواد صرف وقت کے تخلیقی سیلان ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ بیشتر مسلم فلسفیوں اور ماہرینِ دینیات نے خدا کے مکمل طور پر پیش داں ہونے کو حقیقی، فی البدیہہ تخلیق کے مقابلے میں محفوظ و مصئون رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا اولاً خالق ہے۔ لیکن ایک ایسا خالق جو پہلے ہی سے مقرر کردہ نقشے کے مطابق تخلیق کرے وہ صحیح معنوں میں خالق نہیں رہتا۔

اقبال نے تخلیق کے علاوہ جس دوسری صفت پر زور دیا ہے وہ خودی، انفرادیت یا شخصیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلم مفکروں اور صوفیوں نے نو فلاطونی اور ویدانتی مفکروں کی راہ اختیار کر لی تھی جس کا نتیجہ ہمہ اوست ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس میں ایک ہر جگہ دائر و سائر ہستی شخصیت کی صفات پر غالب آجاتی ہے۔ چنانچہ بعض مسلم مفکروں نے بعض

آیاتِ قرآنی کی تشریح ہمہ اوستی رنگ میں کی۔ مثلاً یہ آیت لیجیے ھو الاوّل والآخر والظاہر والباطن، یا پھر یہ نہایت ہی دل نشیں آیت لیجیے، اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض ..... الخ اقبال اس کی تشریح الٰہی تفرد اور خودی کے تصور کی روشنی میں کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "بے شک ابتدائی جملے سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خدا کے تصور بہ حیثیت فرد سے گریز ہے۔ لیکن جب ہم باقی آیت میں روشنی کی تمثیل کی چال ڈھال کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے بالکل برعکس احساس پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح تمثیل کو ایک خاص شکل میں ڈھالا گیا ہے اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ روشنی کو پہلے شیشے میں منزوی کر کے جو ایک واضح اور پوری طرح متعین ستارہ سے ملتا جلتا ہے، ایک عالمگیر مبہم نفسِ کل کا تصور بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔"

اقبال کی رائے میں یہودی، مسیحی اور اسلامی صحائف میں ذاتِ باری کو جو نور سے تشبیہ دی گئی ہے اس کی اب نئے سرے سے تشریح کرنی چاہیے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تفرد سے بعض اذہان میں تحدید و تعیین کا احساس پیدا ہوگا۔ اس لیے اس کا ازالہ کرنے کے لیے یہ واضح کرتے ہیں کہ کس طرح لاانتہا تخلیقی قوت کا تفرد اپنے اظہارات یا اپنے مخصوص اناؤں کو پوری پوری آزادی دینے سے کسی طرح محدود نہیں ہو سکتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ تعین محض ایک زمانی و مکانی تصور ہے۔ اشیا ایک دوسرے کو زمان و مکان ہی میں محدود کرتی ہیں۔ ذاتِ احدیت زمانی و مکانی اعتبار سے معین یا لاانتہا نہیں۔ یہ خصوصیات یا انواع مکان و زمان میں متمکن اشیا اور حوادث ہی پر حاوی ہیں۔ انائے مطلق کا لاانتہا ہونا درحقیقت اس کی تخلیقی اہلیتوں کے لامحدود ہونے سے عبارت ہے، جن کا اظہار جزوی طور پر ہماری اپنی کائنات میں ہوا ہے۔ بالفاظِ دیگر ذاتِ باری کا لاانتہا ہونا کیفیت کے اعتبار سے ہے، کمیت کے اعتبار سے نہیں۔ اس سے لامحدود سلسلے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خود ان میں محدود نہیں۔ خالق اور اس کی آفرینش کے متعلق اقبال کا تصور درحقیقت ایک ہی تصور کے دو رخ ہیں۔ چونکہ خدا مسلسل تخلیق کرتا رہتا ہے اس لیے اس کی آفرینش یا کائنات ایک ایسا واقعہ نہیں جو ہمیشہ کے لیے طے ہو گیا ہے۔

حقیقت ایک عمل ہے واقعہ نہیں۔ خدا انائے مطلق ہے، جس کی سرشت تخلیق ہے۔ انائے مطلق سے صرف انا ہی پیدا ہوتے ہیں۔ خدا اشیا نہیں تخلیق کرتا بلکہ افراد یا انا تخلیق کرتا ہے۔ الٰہی قوت کا ہر ذرہ

خواہ وہ درجۂ حیات میں کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو، ایک انا ہے۔ اقبال کی رائے میں مدارجِ حیات تمام تر خودی کے درجات ترقی ہیں اور بس۔ ان کے اپنے الفاظ میں "حیات کے تمام سرگرم میں خودی کی نوا بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے۔ تا آنکہ اس کا زیر و بم انسان میں اپنے درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔"

اقبال نے اشعریوں کی دنیائے "جواہر" کو ایک روحانی کثرت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس سے وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو لائبنز کے واحدوں سے رونما ہوتی ہے، یا رومی اور غالب جیسے صوفی شعرا کے ہاں دکھائی دیتی ہے، جنھوں نے ازذرہ تا بہ مہر کائنات کا تصور ایک انا کے طور پر کیا، اور مادہ کو اس کی سرگرمیوں کا خارجی پہلو قرار دیا ہے۔ یا جیسا کہ میر درد نے ارواح کو شیشوں سے تشبیہ دے کر کہا تھا کہ

سختی سے نہ رکھ قدم تو زنہار آہستہ گذر میانِ کہسار
ہر سنگ دکانِ شیشہ گر ہے

اقبال کے نزدیک خدا ایک سکونی اصلیت نہیں بلکہ ایک حرکی سیلان ہے، اور اس کے تمام مظاہر اور مخلوقات اس لیے ہیں کہ وہ بھی اپنے طور پر تخلیق کریں۔ وہ پورے خلوص سے یقین رکھتے تھے کہ قرآن کا تصورِ الٰہیت یہی ہے اور مشہور حدیثِ قدسی "لا تسبوا الدھر" ہمیں تخلیقی دوران کا وہ حرکی تصور مہیا کرتی ہے جس پر برگساں نے اپنے مابعد الطبیعیات کی شاندار عمارت تعمیر کی تھی۔

اسلام کا نظریۂ حیات

از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

یہ کتاب مرحوم خلیفہ صاحب کی مشہور و معروف انگریزی تصنیف "اسلامک آئیڈیالوجی" کا ترجمہ ہے اور خوش نما ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور